© rasailojaraid.com

گاہے گاہے باز خواں

مولانا سمیع الحق ۔ مدیر "الحق"

بلخ اور غزنی
یعنی
عظمتوں کے مزار پر نگاہِ عبرت و حسرت

(عبرت و موعظت، فکر و نظر اور احساس زیاں کی انگیخت)

غیرت و حمیت کی سرزمین افغانستان پر موجودہ روسی یلغار اور مجاہدین کی زبردست تحریکِ مزاحمت و جہاد کے جنیوا معاہدہ تک آٹھ سال مکمل ہو گئے۔ کتنی پیش رفت ہوئی؟ عالم اسلام نے اس پر کتنی توجہ دی؟ اور مجاہدین کی یہ جنگ عالم اسلام کے دفاع کی جنگ ہے؟ یہ موضوع اپنی جگہ اہم ہے، مگر ایسا کیوں ہوا؟ روسیوں کو افغانستان میں جبر و استبداد اور بہیمیت کا اس قدر مظاہرہ کرنے کے مواقع کیوں اور کیسے مہیا ہوئے؟ اس کے محرکات، پس منظر، عوامل اور اسباب کیا تھے؟ روس کے لیے افغانستان میں در آنے کی راہ کیونکر ہموار ہوئی؟ اس کی علامات، خطرات اور طریقہ ہائے واردات معلوم کر کے اپنے ملک اور ملتِ مسلمہ کے مستقبل پر بھی مصلحینِ امت کے لیے غور و فکر کی نئی راہیں کھل سکتی ہیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر جناب مدیر الحق مولانا سمیع الحق مدظلہ کے سنہ ۷۱ء میں سفرِ افغانستان کی تحریر کا ایک اہم حصہ پیشِ خدمت ہے جس میں افغانستان کے موجودہ حالات اور عملاً جہاد کے حوالے سے ماضی اور حال کے آئینے میں عبرت و موعظت اور فکر و نظر کی جلا کا کافی سامان اور نورِ بصیرت موجود ہے، اور اس سے ان شاء اللہ کارواں کو احساسِ زیاں کی انگیخت ہوگی ——

(عبدالقیوم حقانی)

آج ۲۲ جون سنہ ۷۱ء ہے اور عالم اسلام کے بطلِ جلیل، مجاہدِ اعظم سلطان محمود غزنویؒ کے شہر میں جانے کا پروگرام ہے۔ غیور مسلمانوں کی سرزمین افغانستان میں ہماری آمد کا دسواں دن ہے۔ برادرِ محترم قاری سعید الرحمٰن صاحب راولپنڈی بھی اس سفر کے ساتھی ہیں —— بابر اور ابدالی کے دیس، مجاہدِ اسلام محمود غزنویؒ کے وطن افغانستان کی زیارت کی دیرینہ آرزو تھی۔ ہمارے پڑوس کے یہ مغربی خطے کبھی ہمارے میراثِ علم و حکمت کے علمبردار و امین تھے۔ دین و دانش کی شعاعیں ادھر ہی سے مشرق کو مالا مال کرتی تھیں۔ پھر غلام ہندوستان کے زمانہ میں بھی یہی خطہ اور غیور افغانوں کا چھوٹا سا ملک حریت اور جہادِ آزادی کا مدرسہ بنا ہوا تھا۔ اور گویا ایشیا کا یہ بلجیم کمزور قوموں کی قوتوں کا معیار اور اپنی آزادی کا آپ محافظ رہا۔ یہ جیالے افغانوں کا وطن ہے جنہوں نے عظیم برٹش امپائر کے استعماری عزائم کو روندوں خاک میں ملائے رکھا جہاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلافتِ راشدہ کے ابتدائی ادوار ہی میں اسلام کا نور پہنچا اور بحیثیت قوم پوری ملّتِ افغانیہ نے اسلام کو لبیک کہا۔ مغرب پورے جاہ وجلال کے ساتھ بھی اسے غلام نہ بنا سکا اور ایک عرصہ تک مغربیت کی پوری زور آزمائی کے باوجود اسلامی شریعت کی روح یہاں کارفرما رہی مگر آج کا افغانستان اتنے ہی جوش اور ولولے سے مغرب کی مادہ پرست تہذیب سے بغلگیر ہو رہا ہے اور مشرقی یورپ کے راستے سے آئی ہوئی مغربیت گویا اپنی سحر کاریوں میں دو آتشہ ثابت ہو رہی ہے مغرب سے مقابلہ آسان تھا مگر مغربیت عالمِ اسلام کے لیے اس دور کا سب سے بڑا فتنہ ثابت ہوئی۔ کس کی تاب تھی کہ اس کی چکا چوند کے سامنے ٹھہر سکتا۔ اور ایسا کیوں نہ ہو قیامت سے پہلے اس تہذیب ہی کی کوکھ سے نکلنے والا فتنہ دجّال ہی تو ہوگا جو پورے عالمِ اسلام کو دامِ تزویر میں لے لے گا۔

پچھلے دس دنوں میں ہم نے کابل اور اس کے گرد و نواح میں بہت کچھ دیکھا۔ شمال مغرب میں سینکڑوں میل دور ترکستان جاتا ہوا مزارِ شریف (جو حضرت شاہ ولایت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب ہے) کی زیارت ہوئی۔ اور اس سے ذرا دور روسی سرحد کے سایہ میں وہ ویرانہ بھی دیکھا جو کبھی بلخ کے نام سے عالمِ اسلام کا مرکز علم و سیاست بنا ہوا تھا۔ جہاں سے علم و حکمت کے چشمے پھوٹ کر عالمِ اسلام کے دل و دماغ کی حیاتِ نو کا ذریعہ بنتے تھے۔ اس کے جنوب میں دریائے آمو (جیحون) واقع ہے۔ اس علاقہ میں آریائی تہذیب و تمدن پروان چڑھی، زردشت کی مذہبی آتش پرستی نے یہاں رواج پایا اور اس دور کا سب سے بڑا آتشکدہ یہیں بنایا گیا۔ تاریخ کے ہر دور میں بلخ نے اپنے اثرات چھوڑے اور بلخ، باکتر، بان ہجدی، باختر، باہیکا، باخل، پامیک، بلخ بامی، زراسپ اسی کے مختلف نام رہے۔ پھر عہدِ فاروقی میں اسلامی افواج، ترک تازیوں کا مرکز بنا۔ خراسان کے بھی خطے تھے جو حضرت فاروقِ اعظمؓ کے زمانہ ۲۳ ہجری میں ان کے بھیجے ہوئے ایک سالار حضرت احنفؓ ابن قیس اور ان کے جانباز ساتھیوں ربعیؓ بن عامر التیمی، عبداللہؓ بن ابی عقیل الثقفی، امام غزالؒ الہمدانی جیسے بہادر شاہسواروں کی آماجگاہ بنے۔ شہنشاہِ فارس یزدگرد جو بلخ میں پناہ لیے ہوئے تھا یہیں سے غائب و خاسر ہو کر دریائے جیحون کے راستہ خاقان کی حکومت میں بھاگ نکلا اور حضورؐ کے ایک بہادر سپاہی حضرت احنفؓ کے ہاتھوں نیشاپور سے طخارستان تک اسلام کا علم لہرانے لگا۔ یہیں حضرت احنفؓ کے ۲۴ ہزار سربکف مجاہدین نے خاقان کے عزائم خاک میں ملا دیئے اور اسے شکستِ فاش اٹھانی پڑی۔ قلمروِ اسلام میں آنے کے بعد بلخ سامانی غزنوی، سلجوقی اور صفاری سلاطین کی توجہات کا مرکز بنا اور بسا اوقات پایۂ تخت رہا۔ اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ اس شہر میں ایک ہزار دینی دار العلوم، بارہ سو جامع مسجدیں اور بارہ سو حمام آباد تھے۔ علم و ہنر، سیاست و حکمت، طب و فلسفہ، ادب و تصوف میں نابغۂ روزگار شخصیتیں اِن خطوں نے اسلام کو دیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی قوموں کے لیے جو تازیانے مقرر ہیں وقفہ وقفہ سے وہ بھی برستے رہے اور بلخ بائیس ۲۲ مرتبہ بہت بڑی تباہی اور تخریب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا نشانہ بنا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۲۲۰ء مطابق ۶۱۷ھ میں چنگیز خان کی فوجیں آئیں اور وحشت و بربریت میں تمام بربادیوں کو مات کر گئیں۔ آج پھر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، مگر اس کے اس پار بخارا اور سمرقند، خوارزم اور فرغانہ اس دور کی سرخ چنگیزیت کے پنجۂ غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔

الغرض بلخ قبۃ الاسلام اور اُم البلاد نے اسلام کے عہدِ عروج میں ایک مثالی کردار ادا کیا۔ اس سرزمین کے کنارے دریائے آمو (جیحون) بہتا ہے جو آج اس سرخ چنگیزیت کے سامنے سراب کی مانند ایک لکیر ہی ہوئی ہے اور اس سے دور دور بسے کروہ دریا بہتا ہے جس کا کبھی ماوراء النہر کے نام سے پوری اسلامی دنیا کے علم و حکمت کے ایوانوں میں غلغلہ رہا ہے۔ یہاں کے علماء اور فقہاء اپنی فقاہت و حکمت اور علمی تبحر کے لحاظ سے عالمِ اسلام کے لیے ایک ممتاز مکتبِ فکر بن گئے تھے۔

اب ذرا چشمِ تصور سے دریا کے اس پار نظر دوڑائیے! وہ سامنے بخارا اور سمرقند ہے، امام بخاریؒ کا مدفن جن کی کتاب "صحیح بخاری" مسلمانوں کے ہاں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ امام ترمذیؒ کی بستیاں صاحبِ ہدایہؒ ان علاقوں ہی میں فقہ کے دریا بہا رہے تھے۔ یہاں سے حدیث اور فقہ کی تابندگی اور زندگی ملتی رہی۔ آج بھی ہماری گردنیں ان کے احسانات میں دبی ہوئی ہیں۔ ہم نے جو کچھ پایا ان ہی علاقوں سے پایا، یہ اسلام کے امین تھے مگر آہ! اب وہاں کیا ہے؟ اپنے جلیل القدر امام بخاریؒ کا مدفن، ترمذیؒ کا مولد اور صاحبِ ہدایہؒ کا نشان شاید وہاں کے باسیوں میں سے بھی کسی کو معلوم نہیں۔ ہم پردیسیوں کے تو وہاں نزدیک جانے سے بھی پر جل جائیں گے۔ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔

——— تو بلخ کے کھنڈرات پر کھڑے ہو کر خوب آنسو بہائیے۔ اور سرخ سرحد کے اس پار اپنی عظمتوں کے مزار پر ایک نگاہِ حسرت ڈال لیجیے! وہ دیکھیے آج بخاریؒ اور ترمذیؒ کی سعید روحیں کتنی بے چین ہیں، ان کی نوجوان نسلوں کو شاید اسلام سے اتنا تعلق ہو کہ ہمارے آباؤ اجداد مسلمان کہلاتے تھے، بڑے بوڑھے اپنے ایمان کی دولت بچانے کی خاطر سب کچھ لٹا کر دوسرے ملکوں میں پناہ گزین ہو گئے اور زیادہ تر روسی استبداد کا نشانہ بن گئے ——— صد حیف کہ کیسی کیسی متاعِ بے بہا ہمارے ہاتھوں شامتِ اعمال کی وجہ سے لٹ گئی ——— اور سرحد کے اس پار یہ بلخ ہے، یہ بھی تو اس وقت عہدِ ماضی کا ایک شکستہ سا رہ گیا ہے۔ یہاں کے باسیوں میں سے اکثر کو معلوم ہی نہیں کہ آج بھی اس کے گرد و اطراف کے قریب علم و حکمت کے کیسے کیسے خزانے مدفون ہیں۔ کبھی یہاں کے طاق و ایوان قال اللہ اور قال الرسول سے گونجتے تھے اور اب زوال پذیر قوموں کی طرح اونگھتے ہوئے اپنی عظمت سے بے فکر باشندوں کی پناہ گاہیں ہی ہیں۔ کبھی ہر گلی مدرسہ تھی اور ہر گھر خانقاہ، اولیاء کا ہجوم اور ائمہ عصر اساطینِ علم و فقہ کا ازدحام ——— اور آج نہ کوئی مدرسہ ہے نہ خانقاہ، نہ کوئی عالم معلوم نہ کسی استاد کا چرچا۔ اس لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حال کی تلاش سے کیا فائدہ، ماضی کے تجسس میں نکل جائیے، قلب و نظر کی تسکین کا کچھ سامان شکستہ کھنڈرات ہی سے مل سکے گا، ماضی سے کیے ہوئے حال نے تو بدحالی کے یہ دن دکھائے۔

ـــ ترد دیکھیے وہ شیخ الاسلام سلطان احمد خضرویہؒ کی ٹوٹی پھوٹی قبر ہے جو ۲۴۰ھ میں ابراہیم بن ادھمؒ، بایزید بسطامیؒ اور امام حاتم اصمؒ کے معاصر تھے۔ تصوف اور معرفت کی کتابیں ان کے حالات عالیہ سے لبریز ہیں۔ کرامت اور علو مرتبت کا یہ عالم تھا کہ بسا اوقات جہاں قدم پڑتا وہاں زمین سبزہ اُگا دیتی، مگر یہ کون سی بڑی بات ہے، یہ لوگ تو مُردہ دلوں کو حیاتِ جاودانی بخشتے تھے، خاک ان کی نظر سے کیمیا ہو جاتی تھی۔ ذرا دائیں جانب ہٹ کر اُن کی پاکباز رفیق حیات خاتون کا مزار ہے۔ چاروں طرف دیواروں اور گنبد سے ڈھکا ہوا، اندر جانے کا راستہ نہیں۔ اس لیے کہ یہ اُس زمانہ کی خاتون تھیں جو عفت و حیا، خوفِ خدا اور ایمان و یقین کا پیکر ہوا کرتی تھیں، جاتے جاتے وصیت کر بیٹھیں کہ میری قبر کو چاروں طرف سے عمارت میں ڈھانک دیا جائے کہ بعد از مرگ کسی غیر محرم کو قبر پر بھی نگاہیں ڈالنے کا موقعہ نہ ملے۔ بے شک یہ اُن مومنات قانتات میں سے ہوں گی جن کی پاکیزگیوں کو اللہ کریم نے قرآن میں سراہا ہے، وہ رونقِ محفل بننے والوں میں سے نہ تھیں۔ بلا شبہ اس زمانہ کی خواتین مرد سے مساوات کی قائل نہ تھیں، مگر ایسی صفات کی بدولت اللہ کریم اُنہیں نہ صرف مساوی بلکہ مردوں سے بڑھا بھی دیتا تھا۔ ولیس الذکر کالانثی۔

شیخ الاسلام خضرویہ کے مزار سے ذرا جانب شرق چلے جائیے یہاں صالحین کے ایک جھرمٹ میں خواجہ ایوب انصاری آسودۂ استراحت ہیں، یہ اپنے وقت کے ممتاز و معروف عالم و عارف خواجہ عبید اللہ انصاریؒ کے والد ماجد ہیں، خود بھی بڑے ولی اور عارف کامل خواجہ عبید اللہ کا مزار ہرات میں ہے ـــ ع این خانہ ہمہ آفتاب ہیں، اردگرد قبور کے نشانات ہیں، کچھ بوسیدہ کتبے جو پڑھے نہیں جا سکے مگر ہماری مجد و شرف کی کیا کیا نشانیاں خاک کے ان ڈھیروں میں پنہاں ہوں گی۔ وہاں سے آگے جائیں تو سڑک چھوڑ کر قاضی ابو مطیع بلخی کے مزار پر حاضری دیں، یہ اپنے وقت کے ممتاز عالم قانونِ اسلامی اور شریعت کے امام تھے۔ نام عبد الحکیم بن عبد اللہ، کنیت قاضی ابومطیع منظوم کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے تلمیذ اور قاضی ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کے رفیقِ طریق تھے، تاریخ وفات اشعار میں "بجہان علم" ۱۹۹ قمری ہجری لکھی ہے۔

اب ہمارا بردبار اور معمر ترکستانی قائد جسے مزار شریف کے متولی و خطیب اور وہاں کے دیگر علماء نے ہمارے ہمراہ کیا ہے۔ ہمیں فقیہ امت ابو اللیث سمرقندی کے مزار پر لے گیا۔ فقیہ ابو جعفر ہندوانی کا یہ قابل فخر شاگرد نصر بن محمد بن احمد سمرقندی فقہ حنفی کا اہم ستون ہے۔ اپنے وقت میں امام الہدیٰ کے لقب سے علمی دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ فقہ حنفی اور دیگر علوم میں بے شمار کتابیں تصنیف کیں، کتب تذکرہ میں ان کی کئی کتابوں تنبیہ الغافلین، البستان، شرح الجامع الصغیر، النوازل والعیون والفتاویٰ، خزانۃ الفقہ، مقدمہ فی الفقہ، تفسیر القرآن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فتاوٰی ابواللیث وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ علمی اور فقہی حلقوں میں آج بھی اُن کے فتاوٰی اور اقوال کی بازگشت سُنائی دیتی ہے، شہر بلخ سے باہر ۳۷۶ھ مطابق ۹۸۵ء یا ۳۷۳ھ یا ۳۷۵ھ یا ۳۹۳ھ میں وفات پائی۔ ان کی عظمتوں کے سامنے گردن سرنگوں ہو جاتی ہے کہ آج بھی رہا سہا جو کچھ مسلمانوں کے پاس ہے ایسے ہی بزرگوں کی محنتوں کا ثمرہ ہے ــــ مزار کے شکستہ تختہ پر ایک اور قبر ہے جو کسی عالم اور حبرِ اُمّت ہی کی ہوگی، مگر نام و نشان نامعلوم، فقیہ ابواللیث کے سرہانے کتبہ بھی گردشِ ایام کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، اس پر دو ایک سطریں باقی ہیں جو مشکل سے پڑھی جاتی ہیں۔ اپنی عظمت کے آثار کی حفاظت غیور قوموں کا شیوہ ہے مگر خدا معلوم افغانستان کی حکومت کبھی ان آثار کی طرف توجہ بھی دے سکے گی یا نہیں! کلچر اور ثقافت کے جشنوں پر لاکھوں روپے اُڑانے والی قومیں اپنی اصلی تہذیب و تمدن کی بنیادوں کی طرف کم ہی متوجہ ہوا کرتی ہیں اور اپنے ماضی سے بے خبر ملکوں کے عجائب خانوں کی رونق فراعنہ کے آثار گوتم بُدھ کے نقوش اور کنشک کے گھسے پھٹے باقیات ہی سے ہوتی ہے ــــ الغرض دونوں قبریں کھلے میدان میں اور بلخ کے اکثر مزارات کی طرح گوشۂ گمنامی میں بدعات و رسوم سے دُور مزارِ غریباں بنی ہوئی ہیں۔ اللہ کی شان جن لوگوں کی زندگی اتباعِ سُنّت کی تلقین، ظواہرِ شریعت کی حفاظت اور بدعات و منکرات سے جہاد میں گذری عموماً اُن کی قبروں کو بھی اللہ کریم نے ان خرابیوں سے محفوظ رکھا۔ یہ ایک صلہ ہے کہ خالص اپنے ربّ کے ہونے والے بندوں کو دُنیا میں بھی مل رہا ہے۔

ایک اور سمت میں جائیے تو خواجہ عکاشہؒ کا مزار ہے، کہنے والوں نے کہا کہ ابراہیمؒ بن ادہم کے والد بزرگوار ہیں، خواجہ آب کشاں کے نام سے معروف ہیں۔ خواجہ آب کشاں ابراہیم ادہم کے والد ہوں یا نہ ہوں مگر اُس سلطانِ دُنیا و دین کو جسے اقلیمِ معرفت ابراہیم ادہم کے نام سے جانتی ہے، اسی علاقہ سے نسبت رہی، وہ یہاں کے فرمانروا تھے ــــ جب رات کو اپنی خوابگاہ کے اوپر کسی کی آہٹ سُنی تو پوچھنے پر کسی نے کہا کہ چھت پر اپنا گمشدہ اونٹ ڈھونڈ رہا ہوں، سلطانِ بلخ کو تعجب ہوا، پوچھا کہ شاہی خوابگاہ کی چھت اور اونٹ؟ جواب میں ایک ملکوتی آواز آئی کہ ارے غافل! تو جب کمخواب اور اطلس کے زرّیں بستروں میں خدا کو ڈھونڈھ رہا ہے تو پر اونٹ کی تلاش تو اس سے کم تعجب خیز ہے ــــ تیر نشان پر لگ گیا، ابراہیم گھائل ہوگئے اور مرغِ بسمل کی طرح تڑپتے ہوئے تخت و تاج کو غیر فانی سلطنت، اقلیمِ عشق سے ٹکرا دیا، اب دل کے آئینہ میں اپنی برزخی منزل نگاہوں کے سامنے تھی جس میں نہ کوئی مُونس تھا نہ غمخوار، نہ لشکر و سپاہ کا ہنگامہ تھا نہ دولت و سلطنت کی جاہ و جلال ــــ سفر دُور دراز درپیش مگر زادِ راہ معدوم، ایک عادل اور قادر قاضی کی عدالت مگر نہ گواہ نہ وکیل ــــ پھر دُنیا کی اس چند روزہ حکومت اور شوکت کی کیا وُقعت رہ سکتی تھی؟ مملکت خراسان کو خیرباد کہا، وسعتِ دل کی پنہائیوں میں گم ہو گئے ــــ ملک نیم شب کی حلاوتوں کے سامنے ملک نیمروز کی سرابی لذّتوں کی کیا نسبت ــــ اور آج ابراہیم ادہم ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلطان و امیر نہیں بلکہ عارفانِ طریقت کی نگاہوں میں سلطانِ دین، سپہرِ غ قافِ یقین، گنجِ عالمِ عزلت، صدیقِ روزگار، روزگار ہیں (عطارؒ نے) سونے چاندی کے خزانوں کو لات ماری، شیخِ عراق جنید بغدادیؒ کی زبان میں مفتاح العلوم بن گئے اور علمِ حقیقی کے مخفی خزانوں کی کنجیاں ہاتھ آگئیں، اب قوت و جبروت سے لوگوں کے جسموں کو نہیں کرتے تھے بلکہ دلوں کی دنیا حکمرانی میں مل گئی۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ گذرنے والی رات کو مزارِ شریف میں ایک مجلس کے صدقے چشمِ تصور نے ابراہیم ادہمؒ کا دور گویا محسوس ہوتے دیکھا۔ یہ مجلس عشاء کے بعد روضۂ مبارک (منسوب بہ حضرت علیؓ) کے قدموں میں متولی کے حجرۂ خاص میں چند سراپا اخلاق و شرافت بزرگوں نے رات کے کھانے پہ اپنے نووارد مہمانوں کیلئے منعقد کی تھی جس میں ایک بزرگ نے سراپا سوز آواز میں مولانا رومؒ کی مثنوی کا وہی حصۂ خاص لےکے سنایا جس کا تعلق ابراہیم ادہمؒ کی صحرانوردی سے تھا۔ اور سرزمین پر قصۂ زمین نے ایک خاص اثر پیدا کر دیا، چند لحظوں کے لیے اردگرد سے بے خبر مسحور ہو کر عالمِ خیال میں اپنے آپ کو اُس عہدِ شکوہ میں پایا کہ ابراہیم ادہمؒ گدڑی پہنے سوئے الٰہی میں بادیہ پیمائی کر رہے ہیں محبوبِ حقیقی کا متلاشی بلخ کے قریب دریائے جیحون کے کسی کنارے بیٹھا ہوگا کہ جدائی میں تڑپتی ماں یا بعض روایات کے مطابق دوست احباب تلاش کرتے وہاں پہنچے، ماں نے ابراہیمؒ کو اپنے فیصلہ پر سرزنش کی، ناز و نعمت اور امارت و شوکت کے مقابلہ میں اس فقر و غربت اور بیکسی پر افسوس کا اظہار کیا۔ ابراہیمؒ نے جو گدڑی کو پیوند لگا رہے تھے، اپنی سوئی دریا میں ڈال دی اور پھر یکایک ماں کے سامنے دریا کی مچھلیوں کو حکم دیا کہ مجھے سوئی چاہیئے، ہزاروں مچھلیاں منہ میں سونے کی سوئی لیے پانی میں اُبھر آئیں۔ ابراہیمؒ نے سونے پر نگاہِ حسرت ڈالتے ہوئے کہا مجھے اس کی کیا ضرورت! اس متاع کی تو میرے ہاں فراوانی تھی، مگر میں نے اسے سکون و اطمینان اور وصالِ حقیقی کی لازوال دولت کے بدلے ٹھکرا دیا ہے۔ اب مچھلیوں نے دوبارہ غوطہ لگایا اور ایک مچھلی منہ میں وہی سوئی لیے ہوئے ابراہیمؒ کے قدموں میں ڈال آئی، اور اس طرح ابراہیمؒ نے اپنی والدہ کو سمجھانا چاہا کہ اماں جان یہ سلطنت اچھی ہے یا توپ و تفنگ اور سیم و زر کے زور سے جو چند آدمیوں کے صرف جسموں پر قائم ہوتی ہے، یہ تو قلوب کی حکمرانی ہے ـــ اور انسانوں پر ہی نہیں بلکہ حیوانات تک پر چھا جاتی ہے، ایسے لوگوں کے لیے تو دریاؤں کی مچھلیاں، صحراؤں کے وحوش اور فضاؤں کے پرندے بھی دعا گو رہتے رہتے ہیں کہ ان کے دم خم سے تو اللہ کے نام کا چرچا اور ان کی رونق سے کائنات آباد رہتی ہے ؎

ملک دل بہ کہ چنیں ملک حقیر ـــ رو بدو کرد و بگفتش کامے امیر

باطنی جوئی بظاہر برمایست ـــ ایں نشان ظاہرست ایں ہیچ نیست

یہ ابراہیم ادہمؒ کا قصہ تھا بار ہا جس کے سننے کا اتفاق ہوا مگر رات کی مجلس میں سنانے والا مثنوی مولانا روم کا ایک دلدادہ تھا، پڑھنے کا عجب انداز، ڈوب کر سنا رہا تھا عجیب سوز و گداز اور لکھنے والا مولائے رومؒ ـــــــ

© rasailojaraid.com